R. No. 21?657

Regd. No. 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

# ہماری زبان

Tele. No. 29
Telegrams
ANJUMAN

جلد ۲۲ - شمارہ ۱۱ | ایڈیٹر - آل احمد سرور | علی گڑھ - ۱۵/ مارچ ۱۹۶۳ء

محمد یٰسین

## "ادیب اور آزادی"

ادب میں آزادی کا مسئلہ درحقیقت دورِ حاضر کی پیداوار ہے کیونکہ ہماری سماجی و ثقافتی زندگی میں جو کشمکش آج موجود ہے وہ اب سے پہلے اس قدر شدت سے کبھی محسوس نہیں کی گئی۔ اسی طرح زمانۂ حال سے قبل نہ تو ہماری داخلی و خارجی زندگی میں ایسی زبردست خلیج حائل تھی اور نہ انفرادی و اجتماعی زندگی ہی اس غیر آہنگی کا شکار ہو سکی تھی۔ چنانچہ صنعتی ارتقاء، سیاسی انقلابات اور ذہنی و فکری میلانات میں ناگزیر تبدیلیوں کے باعث ادب اور ادیب کے مسائل بھی کافی پیچیدہ ہو گئے ہیں۔

ادیب کی آزادی کا سوال اگرچہ ہمارے لئے نسبتاً نیا ہے لیکن یہ مسئلہ کسی زمانے میں بھی اٹھ سکتا تھا بشرطیکہ وہ حالات جن سے ہم آج دوچار ہیں کبھی پیدا ہو جاتے۔ دنیائے ادب کی تاریخ کے مطالعہ سے ہمیں ادیبوں اور شاعروں کی مختلف النوع "غلامی" کا پتہ چلتا ہے جس سے ان کی تخلیقات میں وہ انفرادیت اور آفاقیت نہ پیدا ہو سکی جو انھیں بقائے دوام کا مستحق قرار دے سکتیں۔ اہل فن کے لئے سب سے بڑی غلامی "زمانے کی غلامی" ہے۔ کیونکہ اگر کوئی ادیب محض اپنے زمانہ کی پیداوار ہو کر رہ جائے گا تو اس کے یہاں روحِ عصر کی جھلکیاں تو ملیں گی لیکن وہ ادب العالیہ ہرگز نہیں پیدا کر سکے گا، اس لئے کہ اعلیٰ ادب کا خاصہ یہی ہے کہ روحِ عصر سے قدرے ماوراء ہو کر اپنے اندر بلیغ آفاقی عناصر کو سمو لے۔ غلامی کی دوسری قسم "مدرسہ کی غلامی" ہے یعنی فنکار روایات کی تقلید بے جا کو ہی اپنا شعار بنا کر کولھو کے بیل کی طرح ایک ہی راہ پر چلتے جائیں۔ ظاہر ہے ان حالات میں ادب میں کوئی قابلِ قدر جدت یا شگفتگی نہیں پیدا ہو سکے گی اور نتیجہ وہی "لندھور بن سعدان کی داستان"۔ قدماء کی پیروی ادبی صحت کی دلیل اور ہماری بلند نظری کا ثبوت ہو سکتی ہے بشرطیکہ ہم بقول پروفیسر مجنوں گورکھپوری "زندہ ماضی" سے استفادہ کریں۔ اگر اپنی پستی و بے بضاعتی کو چھپانے کے لئے خواہ مخواہ روایات کی آڑ لی جائے گی تو ادب میں اکتا دینے والی یکسانیت اور بسی عوامل کی کارفرمائی کا اندیشہ لاحق ہو جائے گا۔ انگریزی میں نیو کلاسیکل شاعری اور اردو میں غزل کا بیشتر حصہ انھیں رجحانات کی غمازی کرتے ہیں جس سے صالح ادب کو زبردست نقصان پہنچا ہے۔ تیسری غلامی جو ادیب کے لئے سب سے زیادہ مضر ہو سکتی ہے "سیاسی" نوعیت کی ہے یعنی مصنف کسی مخصوص پارٹی یا منشور کا مرید ہو جائے اور بلا ضرورت اندھیرے اجالے میں بھٹکنے کی دعوت دے۔ اس لحاظ سے کمیونسٹ ممالک میں ادب کا جو حال ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ خود ادیب کے ذاتی نقطۂ نگاہ سے اس کی "معاشی غلامی" کچھ کم قابلِ توجہ نہیں کیونکہ کوئی فنکار جب تک اپنی روزی کے لئے دوسروں کا محتاج رہے گا اس وقت تک وہ اپنے سطحِ نظر میں وہ گہرائی و گیرائی نہیں پیدا کر سکتا جس سے عالمگیر ادب پارے وجود میں آتے ہیں۔ درباری اثرات نے یورپین شاعری و ڈرامہ اور مشرقی ادب بالخصوص شاعری (غزل و قصیدہ) پر جو نقوش چھوڑے ہیں وہ محتاجِ وضاحت نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ان قدردانوں نے ادیبوں و شاعروں کی سرپرستی کی اور ان کے فنی فروغ کے سامان مہیا کئے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ ان کے خیالات و جذبات کی پاسداری میں بسا اوقات فنکاروں کو اپنے ضمیر کی آواز بھی دبانی پڑتی تھی۔ ان تاریخی حقائق کے پیشِ نظر ادیب کی مثالی آزادی کے لئے اسے عصری، روایتی، دبستانی، سیاسی اور معاشی غلامیوں سے نجات دلانا سماج کا فرضِ اولین ہے۔

آزادی عام انسانوں کا قدرتی حق ہے لہٰذا اس کا مطالبہ صرف سماجی غلاموں کے لئے بلکہ آزادی کی ذہنی ترقی اور صلاحیتوں کی

پروان چڑھانے کے لئے بھی ازبس ضروری ہے ۔ روسو (Rousseau) اور دیگر مفکرین نے آزادی کا جو تصور پیش کیا اس کے پس پشت نہ صرف سیاسی آزادی تھی بلکہ آزادی کا وہ جامع تصور تھا جس کی بازگشت "انقلاب فرانس" کے نعروں میں سُنائی دیتی ہے اور جو اب تک دوسرے مصلحین و مفکرین کی زبان و قلم سے مترشح ہوتے رہے ہیں۔ ادیب کا فن زندگی کی تخیلی عکاسی کرتا ہے جس میں اس کی شخصیت کا زبردست حصہ رہتا ہے اس لئے اگر وہ مذکورہ غلامیوں کی قربان گاہ پر اپنے فن کو بھینٹ چڑھا دے تو اعلیٰ ادب کا تصور محال ہو جائے گا۔ ادیب کی سماجی ذمہ داریاں ضرور ہیں لیکن محض ایک حد تک اور ایک خاص مقام سے۔ نقادوں نے بجا طور پر صالح ادیبوں کو "غیر ذمہ دارانہ تبلیغ" کا حامل بتایا ہے اس لئے وہ عارضی مسائل سے قطع نظر آفاقی اور اعلیٰ انسانی اقدار کو اپنے فن کا مرکز بناتے ہیں اور ان کی تخلیقات جغرافیائی حدبندی سے بے نیاز ہو کر عام انسانیت کی لے ہوتی ہے۔

لہٰذا ہمارے نزدیک شخصیت کا اظہار بنیادی طور پر ادیب کا مقصد اولین ٹھہرا۔ اس شخصیت کے پیچھے کون کون سی قوتیں کارفرما ہیں ان کا تعین بہت مشکل ہے۔ فرانسیسی نقاد "طین" (Taine) نے تو شاعر کی انفرادیت کو نسل، روح عصر اور ماحول (Race-Milieu-Moment) کی حد میں مقید کر دیا لیکن اس سے ادبی تنقید کا حق نہیں ادا ہوتا۔ شاعر یا ادیب کا فن بہت حد تک وجدانی ہوتا ہے یعنی خارجی دنیا اور کائنات پر جب اس کی نظر پڑتی ہے تو اس کے ذہن پر کچھ تاثراتی خاکے ابھرتے ہیں جن میں رنگ بھر کے وہ شاہکاروں کی تخلیق کرتا ہے۔ اب اگر ادیب و شاعروں کو یہ آزادی نہیں کہ وہ زندگی کو اپنی مخصوص شخصیت کے آئینہ میں دیکھ سکیں تو ان کا نظریہ حیات یقیناً معکوس ہو کر رہ جائے گا۔ انیسویں صدی میں روسی ادب اپنی حقیقت پسندی کے باوجود تخلیقی ادب سے بہت قریب تھا۔ "دستووسکی" (Dostowosky) کی بالغ نظری اور نفسیاتی تجزیہ "ترگنف" (Turgenev) کی فطری عکاسی اور ژرف نگاہی اور "طالستائے" (Tolstoy) کے فنکارانہ شعور اور انسانیت نوازی سے کون انکار کر سکتا ہے لیکن ان مشاہیر کے بعد روس میں یکایک اعلیٰ ادب کا قحط الرجال سا ہو گیا ہے کیونکہ ایک مدرسۂ فکر کی غلامی اور اشتراکی منشور کی تبلیغی مہم نے جدید روسی ادب کو نئے شکنجوں میں کس رکھا ہے۔ اگرچہ ایک زمانے میں گورکی (Gorky) اور اس کے قلمی معاونین نے یورپین ادب کو مریضانہ رومانیت (Morbid Romanticism) سے بچانے میں زبردست خدمات انجام دیں لیکن یہ قلمی جہاد بالآخر پارٹی بازی کے لئے وقف ہو گیا جس سے انحراف بورس پاسترنک (Pasternak) جیسے فن کاروں کی موت ہے۔

ہم نے ادب کے لئے شخصیت کا اظہار لازمی قرار دیا ہے لیکن اس کا مقصد یہ نہیں کہ وہ تمام دُنیا سے خود کو نرالا ثابت کرنے لگے۔ ایسی حالت میں وہ حسین فرشتوں کی طرح خلا کی وسعتوں میں پَر مارتے رہ جائیں گے۔ ادیب کے لئے شخصی آزادی کے ساتھ سماجی شعور بھی لازمی ہے ورنہ اس کے دوسری طرف بہک جانے کے امکانات ہیں۔ روس کی شدید خارجیت کے برخلاف جدید مغربی ادب کا شدید نفسیاتی میلان اسی تفریط کا نتیجہ ہے سماجی شعور سے بے نیازی نے سترہویں صدی میں انگریز طربیہ نگاروں کو جس عیش کوشی، فحاشی اور عریاں نگاری کی تلقین کی تھی وہ ہم پر واضح ہے۔ اسی طرح بائرن، آسکر وائلڈ اور منٹو انتہائی انفرادیت کی رو میں جن سرحدوں میں پہنچے ہیں اسے صالح ادب کبھی نہیں قبول کر سکتا۔ بیسویں صدی میں ہمارے ادیبوں کو ایک نئی آزادی ملی ہے۔ ادب کا رزمیہ دور (Epic Age) اب ختم ہو چکا ہے لیکن "ذہنی مہابھارت" اور "داخلی شاہنامے" اب بھی لکھے جاتے ہیں، مریضانہ رومانیت کی لاش پر "نفسیاتی ادب" اب اپنے عالیشان محل تیار کر رہا ہے اور ہمارے فنکار شعور و لاشعور کی گہرائیوں میں اتر کر گزرے لمحات اور ماضی کے مبہم نقوش کے سہارے روایتی محبوب کے گیسوؤں کی درازی تک طویل پلاٹ اور غالب کی "محشر خیالی" کے بے ہنگم نمونے بطور کردار پیش کر رہے ہیں۔ آخر مارسل پروسٹ (Marcel Proust) جیمس جوائس (Jams Joyce) اور فاکنر (Faulner) کے یہاں شعور و تحت الشعور، خوابوں اور ان کی مبہم تعبیروں کے سوا اور کیا ملتا ہے؟ شیکسپیر، ملٹن، گوئٹے اور اقبال کی کلاسیکی ژرف نگاہی، توازن، اعلیٰ تخیل، انسانیت اور آفاقیت اب کہاں ہے؟

ادب میں حقیقی آزادی روح و شخصیت کی آزادی ہے محض لطافتوں کی تلاش میں حقائق سے گریز یا حقیقت پسندی کے جنون میں انسانی اقدار سے بے نیازی کسی طرح قابل قبول نہیں ہے۔ صالح ادب کے خالق روس کی جدلیاتی مادیت (Dialectical Meterialism) اور مغربی ادب کی نفسیاتی میلانات کے درمیان ہی اپنا راستہ متعین کر سکتے ہیں۔ ایسا ادب بہرحال داخلیت و خارجیت، اشاریت و مارکسیت، عارضیت و آفاقیت کا امتزاج ہوگا جس میں ہماری تہذیب ثقافت کا رنگ بھی ہوگا اور انسانیت نوازی و اعلیٰ اقدار کا عکس بھی۔ نفسیاتی مدرسہ کی شدید انفرادیت ہمارے لئے اسی قدر مُضر ہے جس قدر اشتراکی جبریت۔ جہاں تک ادب کی حقیقی آزادی کا سوال ہے، علامہ اقبال کا ایک شعر شاید بے محل نہ ہو:۔

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بہ گِل بھی ہے
انھیں پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے

ہماری زبان

۱۵ر مارچ ۷۳ء

## اِس حقیقت پر غور کیجئے

اُردو نے ہماری قومی زندگی کے ہر موڑ پر اپنا نقش چھوڑا ہے۔ آزادی کی لڑائی میں جو نعرہ سب سے زیادہ دلوں کو گرماتا تھا وہ "انقلاب زندہ باد" کا تھا۔ سبھاش بوس نے جب آئی۔ این۔ اے ترتیب دی تو "دلّی چلو" کا نعرہ دیا۔ جب چین کے بدمست حکمرانوں نے ہماری سرحد پر دست درازی کی تو ہمارے جوانوں کے کارنامے سامنے آئے۔ جوان کی اصطلاح سپاہیوں کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ آج یہ اصطلاح نہ صرف ہندوستان کے بچے بچے کی زبان پر ہے بلکہ دنیا کے اخباروں اور رسالوں میں بھی استعمال ہونے لگی ہے۔ آج بھی پارلیمنٹ میں اور چند یا کی سبھاؤں میں جب مقرر اپنی تقریر ختم کرتا ہے تو جس زبان کے شعر سب سے زیادہ استعمال ہوتے ہیں وہ اُردو ہے۔ کبھی کبھار جب اس تقریر کا جواب دینا ہوتا ہے تو تان اُردو کے شعر ہی پر ٹوٹتی ہے۔ اخباروں اور رسالوں میں اپنی بات کی معقولیت ظاہر کرنے کے لئے اُردو کے اشعار سے اب بھی مدد لی جاتی ہے۔ اُردو کے مشاعرے صرف ہماری تہذیبی زندگی کا مظہر نہیں ہیں، ہماری ہر سیاسی کروٹ میں بھی ان سے مدد لی ہے۔ اُردو کے شاعروں نے موجودہ ہنگامی حالات کے متعلق جو نظمیں کہی ہیں اُن کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ ان نظموں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور انجمن بھی ایک مجموعہ شائع کر رہی ہے۔ یہ نظمیں کسی فرمائش کا نتیجہ نہیں، بے ساختہ جوش، جذبے اور تاثر کا اظہار کرتی ہیں۔ خلافت اور ترک موالات کے زمانے سے لے کر ہندوستان چھوڑ دو کے دور تک ہر اہم موڑ پر اُردو کے شاعروں اور ادیبوں نے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے اور قوم کے ضمیر کو بیدار کیا ہے۔ آج بھی یہی ہو رہا ہے۔ کاش اُردو کے حقوق کو نظر انداز کرنے والے اس حقیقت پر بھی غور کرتے۔

## شفیق جون پوری

افسوس ہے کہ ایک طویل علالت کے بعد شفیق جون پوری ہم سے رخصت ہو گئے۔ مرحوم کی صحت عرصے سے خراب تھی۔ وہ دق کے موذی مرض میں مبتلا تھے۔ انھوں نے کئی قابل قدر مجموعے اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ انجمن اُن کے کلام کا ایک انتخاب شائع کر چکی ہے۔ انھوں نے نظمیں اور غزلیں دونوں کہیں اور ہر موضوع کو اپنایا مگر ان کی غزلوں میں جو پاکیزہ تغزل، جو لطیف کیفیت اور غزل کے آداب کے ساتھ ساتھ موجودہ زندگی کے بعض حقایق کی جو ترجمانی ملتی ہے وہ بڑی قابل قدر ہے۔ ادارہ ہماری زبان ان کے پس ماندگان کے غم میں شریک ہے۔

## سیر بین

دیکھے ہولی کے موقع پر دہلی میں مورکھوں کا دن منایا گیا۔ سُنا ہے کئی وزیر اور ممتاز قومی کارکن شامل تھے۔ ہم اس جرأت رندانہ کی داد دیتے ان لوگوں نے گدھے کی سواری کی، جھنڈے اُلٹے لٹکائے، ایسے مکان کی تجویز پاس کی جس پر چھت نہ ہو۔ ساری دنیا کے مورکھوں کے لئے نئے وضع کئے۔ مور کھرم کے سوا ہر قسم کے دھرم سے برئیت ظاہر کی۔ جہال برد کی سبھائیں وجود تھیں، اب اس سبھا کا بھی اضافہ ہو گیا بس اس کی کسر ہے کہ جیو اور جینے دو کے وزن پر مورکھ بنو اور بنانے کا فلسفہ سُنائی دے۔

---

مقدموں، دیباچوں، تقاریظوں کی گرم بازاری کیا کم تھی کہ پیاموں کی وبا شروع ہو گئی ہے۔ اگر وزیروں سے پیام مانگے جائے تو پھر خیریت رہتی۔ آخر وزیروں کو اتنی کانفرنسوں کا افتتاح کرنا پڑتا ہے، سبھاؤں کی صدارت کرنی ہوتی ہے، اتنی نئی عمارتوں کا سنگ بنیاد رکھنا ہوتا ہے۔ پیام بھی دہی دے دیتے۔ مگر اب ادیبوں سے بھی پیام مانگے جاتے ہیں۔ چناں چہ وہ دن دور نہیں جب مقالوں اور تقریروں کی جگہ صرف پیام سُنائے جائیں گے۔ ان پیاموں میں ہوتا ہی کیا ہے۔ کانفرنس یا کام کے آغاز پر مسرت کا اظہار، غیر حاضری کی معذرت۔ آخر میں نیک تمنائیں یا شبھ کامنائیں۔ چنانچہ صدر، نائب صدر، وزیر اعظم اور ریاستوں کے وزیر بچارے سب مروت کے پتلے ہیں۔ ان کا بہت سا وقت پیام دینے میں صرف ہو جاتا ہوگا۔ مگر اس طرح جلسوں کی شوبھا بڑھ جاتی ہے۔ منتظم خوش ہو جاتے ہیں۔ بڑے آدمی نہ سہی اُن کا پیام سہی۔ نام تو چلتا رہتا ہے۔

---

خدا جانے یہ پُرانے لوگ کیسے تھے کہ بڑائی پیچھے رہنے میں سمجھتے تھے۔ اب تو بڑائی اس میں ہے کہ پہلے ہم ہوں۔ اگر صدر انگریزی میں تقریر کریں اور ہندی ترجمہ بعد میں سُنایا جائے تو راشٹر بھاشا کی توہین ہو جاتی ہے۔ اگر گورنر بے چارہ کسی ایسی ریاست کا ہو جہاں ہندی کا رواج نہیں، تو اسے ہندی کی ریاست میں نہیں بھیجنا چاہیے۔ اس میں ہندی کا اپمان ہوتا ہے۔ وہ انگریزی میں تقریر کرے گا اور راج بھاشا کی ذلت ہو جائے گی۔ آخر کسی لاٹ گورنر کو یہ کیا حق ہے کہ وہ ایسا اہم عہدہ قبول کرے، جبکہ وہ ہندی میں تقریر کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ ہم سے بڑی بھول ہوئی، آزادی کے بعد جو جب انگریز گئے تھے، انگریزی کو بھی چلتا کر دینا چاہیے تھا۔ لوہیا جی ٹھیک کہتے ہیں۔ انگریزی ہٹاؤ۔ جب تک انگریزی موجود ہے ہندی کیسے ترقی کر سکتی ہے۔ ہندی کے معاملے میں دوسری زبان والوں کی ہرگز نہیں سُننا چاہیے۔ یہ بنگالی یا جنوبی ہند والے یقیناً انگریزوں کے پٹھو ہیں جبھی تو ایک بدیسی زبان کی خاطر ہندی جیسی دیسی زبان کو نظر انداز کر رہے ہیں۔

## شیخ ممتاز حسین اور شفیق جونپوری

یہ خبر افسوس کے ساتھ سُنی جائے گی کہ ۵ مارچ کو شفیق جونپوری اور ۹ مارچ کو لکھنؤ میں شیخ ممتاز حسین جونپوری کا انتقال ہوگیا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۷۰ سال تھی۔

شیخ صاحب پچھلے تیس سال سے لکھنؤ میں مقیم تھے اور لکھنؤ کی ادبی اور سماجی سرگرمیوں میں پورا حصّہ لیتے تھے۔ ان کے وسیع حلقۂ احباب میں ہر مذہب ملّت اور ہر مکتبِ خیال کے شہری شامل تھے۔

شیخ صاحب مشہور اور ماہر خطاط بھی تھے۔ ان کی کتاب "خطِ اور املا" پر یو۔پی کی حکومت نے ان کو انعام بھی دیا تھا۔ اچھے مزاح نگار اور کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے۔

شفیق جون پوری ایک کہنہ مشق شاعر تھے۔ انکی شعرگوئی کی ابتدا نو سال کی عمر سے ہوئی۔ ابتداءً والد سے اصلاح لیتے رہے نعت وسلام یا حالی کے رنگ میں قومی نظمیں پسند کرتے تھے مگر شفیق صاحب غزل بھی کہتے تھے وقتاً فوقتاً بعض دیگر اساتذہ سے اصلاح لیتے رہے۔ یہاں تک کہ تحریکِ خلافت کے زمانے میں مولانا حسرت موہانی سے عقیدت پیدا ہوئی اور مولانا کا رنگ تغزل پسند آیا۔ کان پور پہنچ کر مولانا سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔

اردو، فارسی، عربی تینوں زبانوں میں شفیق صاحب کی تصانیف کی تعداد چالیس کے قریب ہے۔ ۲۲ کتابیں اور رسائل چھپ چکے ہیں۔ شفیق صاحب نے اوائل عمر میں دو ماہنامے بھی "وحید العصر" اور "طارق" جاری کئے۔ ایک عرصے تک مولانا حسرت موہانی مرحوم کے رسالہ "اردوئے معلّٰی" کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔

## حیدر آباد میں پہلی بار "شبِ افسانہ"

حیدر آباد، ۴ مارچ۔ حیدر آباد میں پہلی بار ۲ مارچ کو ۹ بجے شب بزم سیکش اور یونیٹی لٹریری اینڈ کلچرل سوسائٹی کے زیرِ اہتمام "شبِ افسانہ" منائی گئی۔ ممتاز افسانہ نگار خاتون محترمہ زینت ساجدہ لکچرار زنانہ کالج حیدر آباد نے صدارت کی۔ ریاستی وزیرِ تعمیرات نواب میر احمد علی خاں صاحب اس محفل کے مہمانِ خصوصی تھے۔ "شبِ افسانہ" میں مسز زینت ساجدہ، اقبال متین، عوض سعید، عاتق شاہ، اکرام جاوید، حمید آرموری، کریم رضا، شباب تنویر، محمود آسی، بالا پرشاد گوڑ، حبیب صدیقی، قیصر اصفی، ناصر قمر اور مسعود علی خاں نے اپنے افسانے سنائے۔ (ابنِ نامی)

## شیو پوری میں مشاعرہ

شیو پوری میلے کی نمائش میں میونسپلٹی کی طرف سے ایک شاندار مشاعرہ بہ صدارت جناب چترویدی صاحب کلکٹر ضلع منعقد ہوا، جس میں بیرونی و مقامی شعرا نے اپنا کلام سُنایا۔

(قادر جمال پوری، مہتمم مشاعرہ)

## اُردو سماج جمشید پور

اُردو سماج جمشید پور کا دوسرا انتخابی جلسہ جناب آشنا صدیقی کی صدارت میں ۲۳ فروری کو ۷ بجے شام منعقد ہوا۔ اُردو دوستوں کی خاصی تعداد جلسے میں شریک ہوئی۔ سب سے پہلے سکریٹری نے گذشتہ کارگزاریوں کی رپورٹ پیش کی۔ اس کے بعد جناب ارشد کاکوی کی جواں مرگی پر ایک تعزیتی تجویز پاس کی گئی بعد ازاں سالِ رواں کے لئے ایک نئی مجلس عاملہ کا انتخاب عمل میں آیا۔

انتخاب کے بعد سکریٹری نے اُردو سماج کے آئندہ پروگرام کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ نیشنل ڈیفنس فنڈ کے لئے بڑے پیمانے پر ایک سہ روزہ کلچرل پروگرام کرنے جا رہے ہیں جس میں ایک آل انڈیا مشاعرہ بھی شامل ہے۔

(پریم چند کلین)

## چینی جارحیت اور خواتین شعرا

آل انڈیا ریڈیو حیدر آباد سے خواتین کے پروگرام میں ۸ مارچ کو ایک خصوصی محفل شعر نشر کی گئی جس میں حیدر آباد کی خواتین شعرا نے ملک پر چین کے جارحانہ حملے کی مذمت میں پُرجوش نظمیں اور قومی گیت سُنائے۔

(عالیہ وقار)

## مہابھارت کا روسی ترجمہ

وزیرِ اعظم نہرو کو روس کے بعض ماہرینِ ہندیات کا بھیجا ہوا ایک تحفہ موصول ہوا ہے۔ یہ مہابھارت کے دوسرے حصے "سبھا پرو" کا روسی ترجمہ ہے جو روس میں شائع ہوا ہے۔

وزیرِ اعظم نے روسی سفیر کی معرفت روس کے ان عالموں کا شکریہ ادا کیا ہے جنھوں نے ایسا قابلِ قدر تحفہ بھیجا۔

## حکومتِ فرانس کے تحقیقی وظائف

لکھنؤ۔ ۱۱ مارچ۔ حکومتِ فرانس نے اپنے یہاں سال ۶۴-۱۹۶۳ء کے دوران پوسٹ گریجویٹ ریسرچ یا تعلیم کے لئے چھ وظیفوں کی پیش کش کی ہے۔ وظیفہ کی مالیت تقریباً ۴۲۰ روپیہ ماہانہ ہے تعلیمی فیس کی معافی کے علاوہ طبی سہولتیں بھی دی جائیں گی اور فرانس کے دو طرفہ بحری سفر کا خرچ بھی دیا جائے گا۔

ریسرچ یا تعلیم کے موضوعات میں سے کچھ یہ ہیں: فرانسیسی زبان اور ادب، فلسفہ عمرانیات، تاریخ جغرافیہ، معاشیات، قانون، ریاضیات، علوم مشرقی، فلکیات یا اعداد و شمار۔

وظیفے کی مدت آٹھ سے لے کر نو مہینے ہوگی جس میں توسیع کی جاسکتی ہے

## شہاب سرمدی

### نئے بیج بوؤ

تھم گئی، پُروا
چل گئی اُترا
چھا گیا کُہرا
پڑ گیا پالا
جل گئے سارے کھیت
چلو کسانو! کچھ مت سوچو
مینڈ مینڈ پر پھر منڈلاؤ
نئے بیج بوؤ۔

آلو کی پتی کجلائی
جھلس گئی ہریالی
پھول جھڑے اودھر سرسوں کے
ننگی ہو گئی ڈالی
چنا دبا،
جَو پڑ گیا پیلا،
جل گئی السی
بجھ گیا گیہوں
کبھی ہے پالا، کبھی ہے سیہوں[1]
ان باتوں پر سر نہ کھپاؤ
وقت نہ کھوؤ،
نئے بیج بوؤ۔

ابھی پُرانے بیج نہ پھینکو
انھیں کو پھٹکو، انھیں کو پھُونکو
جانچو، پرکھو
چکنے چکنے دانے چُن کر، موتی سا چمکاؤ
بن پانی ہر کھیت ہے پیاسا،
پیاسوں ہی پر پڑا ہے پالا
ان پیاسوں کی پیاس بجھاؤ
سینچو ان کے جگر کو سینچو،
سینچ کے جوتو، دھوپ دکھاؤ
کھرپی مارو، کھاد ملاؤ،
خوب سنوارو، خوب بناؤ،
اس مٹی کو اور کماؤ
نئے بیج بوؤ۔

[1] ایک فصل خور کیڑا۔

## تنویر سامانی

### وطن کے نوجوانو

اُٹھو کہ پھر امن کی فضاؤں پہ جنگ کے ابر چھا گئے ہیں
چلو کہ چینی درندے گنگ و جمن کے نزدیک آ گئے ہیں
لگاؤ ٹھوکر کہ عقل آئے جنوں میں یہ بوکھلا گئے ہیں
اُٹھو مرے ہم وطن جوانو
وطن پہ جب کوئی وقت آیا ہے تم نے سب کچھ لٹا دیا ہے
تمہارے عزمِ جواں نے اکثر غرور کا سر جھکا دیا ہے
بہادری کہتے ہیں کسے یہ جہاں کو تم نے بتا دیا ہے
اُٹھو مرے ہم وطن جوانو
سنو کہ تاریخ ٹیپو سلطان کی کہانی سنا رہی ہے
چلو کہ جھانسی کی رانی تم کو محاذ پر اب بلا رہی ہے
فضا میں گاندھی کی روح دیکھو اداس اشک آ رہی ہے
اُٹھو مرے ہم وطن جوانو
کرشن و گوتم کی سرزمیں کو غلام ہرگز نہ ہونے دیں گے
ملی ہے آزادی جو وطن کو اسے کبھی ہم نہ کھونے دیں گے
سنو جرس کی صدائے پیہم اُٹھو تمہیں اب نہ سونے دیں گے
اُٹھو مرے ہم وطن جوانو
دھماکے ہونے لگے بموں کے نظر میں ہر سو دھواں دھواں ہے
فضائے میدانِ جنگ میں وقت شعلہ بار و شرر فشاں ہے
جنونِ صد سالہ پستی چھوڑو اٹھو یہی وقتِ امتحاں ہے
اُٹھو مرے ہم وطن جوانو

## غزلیں

### صلاح الدین نیّر

شمعیں بجھتی ہیں دل سلگتے ہیں — ہائے! کیا چیز ہوتی ہے اُمید
رخصت اے تیرگیٔ شب رخصت — جگمگاتی ہے فطرتِ خورشید
تم نے دامن چھڑا لیا اپنا — ہم سے چھوٹا نہ دامنِ اُمید

### واحد پریمی

کون طوفاں کا راز سمجھے گا — ہم اگر ہو رہے کناروں کے
پھول غم دیدہ، غنچے نم دیدہ — کیا یہی رنگ ہیں بہاروں کے
ساقیا مے کدے کی خیر منا — اور تیور ہیں بادہ خواروں کے

### صادقہ نواب سحر

مرے خیال کی دنیا پہ چھا گیا کوئی — مجھے اسیرِ محبت بنا گیا کوئی
یہ مانتی ہوں محبت فریب ہے لیکن — مرے حسین چمن کو سجا گیا کوئی
بنا کے میری محبت کو داستاں رنگیں — نظر کی راہ سے دل میں سما گیا کوئی

قاضی معراج دھولپوری

# ماہ نامہ "آئینۂ سخن"

پنجاب کا نام اُردو کے ساتھ ہمیشہ سے وابستہ رہا ہے۔ اس علاقے کی گھریلو زبان اگرچہ کہ پنجابی رہی لیکن بیرون علاقہ مراسلت وغیرہ اور اندرون صوبہ عامۃ الناس کی ایسی بولی کا تمام تر کام اُردو ہی میں کیا جاتا رہا ہے۔ کرنل ہالرائڈ کے زمانے میں یعنی ۱۸۷۴ء کے اردگرد یہیں جدید شاعری کا سنگ بنیاد رکھا گیا جس کو شعرائے ماجد نے اپنایا اور سارے ملک میں اس کا اتباع کیا گیا، نیز ملک کے شعراء کا ایک بڑا طبقہ اس طرف ملتفت نظر آنے لگا۔ زمانۂ آخر میں بھی عالمگیر، نیرنگ خیال، ادبی دنیا، سروش، ہمایوں، چمنستان، ہزار داستان وغیرہ ایسے محسن علم و ادب پرچے اس سرزمین کا طرۂ امتیاز رہے ہیں اور بعض اب بھی ہیں۔ پروفیسر محمود شیرانی صاحب نے اسی جہت سے "پنجاب میں اردو" نام اپنی گرانقدر تالیف میں اس علاقے کو سراہا اور وہاں کے رہنے والوں کے لسانی کارناموں پر سیر حاصل روشنی ڈالی اور تبصرہ کیا ہے۔ ذیل میں اسی صوبے کے ایک منظوم ماہنامے کا تعارف کرانا راقم سطور کا مقصود ہے جو ۱۸۸۵ء میں انبالے سے شائع ہوتا تھا۔

رسالۂ مذکور کا نام "آئینۂ سخن" ہے۔ اس کی پہلی جلد کا پہلا نمبر پیش نظر ہے جو ۲۵؍ ستمبر ۱۸۸۵ء کو شائع ہوا ہے۔ عرف اس کا "سراپائے معشوق" ہے۔ ہر ماہ اسی رعایت سے طرح کا دیا جانا اس کی خصوصیت ہے۔ یہ چوں کہ پہلا نمبر ہے اس لئے سر کے متعلق مصرع ذیل بطور طرح تجویز کیا گیا ہے۔ ع

برق سی کوند گئی آج ہمارے سر پر

جس میں "ہمارے" قافیہ اور "سر پر" ردیف ہے۔ نیز ماہ اکتوبر کے لئے

ع۔ ترچھی ٹوپی جب وہ رکھتا ہے جواں بالائے سر

اور ماہ نومبر کے لئے:

ع۔ پیدا کرے نہ اور کوئی درد سر دماغ

مصرعے دیئے گئے ہیں، جن میں سے اول الذکر میں "جواں" قافیہ اور "بالائے سر" ردیف۔ اور ثانی الذکر میں "سر" قافیہ اور "دماغ" ردیف ہے۔

اس رسالے کے ابتدائی سرورق پر حاشیہ دوہری لائن کا کشیدہ کیا گیا ہے۔ جس کے درمیان اوپر کی طرف "الشعراء تلامیذ الرحمٰن" تحریر ہے اور نیچے لائن سے باہر یہ شعر ؎

ہاتھ آئے گا یہ موقع نہ تمھیں پھر ہرگز
عاشقو دوڑو کہ تصویر صنم کھنچتی ہے

اس کے بعد صفحے کے درمیانی حصے میں رسالے کا نام "آئینۂ سخن عرف سراپائے معشوق" لکھا ہے اور نیچے اس کے دوہری لائن سے باہر ذیل کا شعر ؎

کھنچ رہا ہے قد دلدار کا نقشہ اس میں
[illegible]

ہر دو شعر مندرجہ صدر گولائی میں ہیں اور دوہری لائن میں نیچے بشکل ہلالی "در مطبع ٹیمپل پریس واقع رحیمی بازار انبالہ چھاؤنی طبع گردید" والا قلم کیا گیا ہے۔ دائیں جانب دوہری لائن کے اندر "جلد ۱ نمبر ۱" اور بائیں طرف "۲۵؍ ستمبر ۱۸۸۵ء" مرقوم ہے۔ زاں بعد "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" لکھ کر متن رسالہ کا آغاز ہوتا ہے۔ پہلے طرح کا مصرع درج ہے اور پھر ہر شاعر کا نام تخلص اور پتے کے ساتھ طرحی و غیر طرحی کلام۔

رسالۂ پیش نظر کا درمیانی سائز ہے۔ نیز یہ دو ٹائٹل پیج اور بارہ صفحات پر مشتمل ہے جن میں سے صفحہ ۱۱ اور بارہ میں نثر کا بھی ایک مضمون تحریر ہے اور باقی پر غزلیات حسب ذیل شعراء نے اس مشاعرے میں شرکت کی ہے:۔

(۱) منشی محمد شریف خاں اشرف مختار کار عدالت واقع پٹیالہ۔ (۲) حکیم سید باقر علی دیوانہ خلف حکیم سید جعفر علی راضی متوطن جیور۔ (۳) میرزا ذاکر حسین پروین خوش نویس ریاست پٹیالہ۔ (۴) ماسٹر غلام قادر شگفتہ ہیڈ ماسٹر شاخ مدرسہ پٹیالہ۔ (۵) مولانا مولوی فضل امام عاجز ساکن قدیم لکھن پور ضلع کانپور حال وارد بریلی۔ (۶) منشی محمد منظور ناظم نقشہ نویس دفتر نہر سرہند واقع پٹیالہ۔ (۷) ناکام نادم مہتمم گلدستۂ ہذا۔ (۸) منشی محمد قاسم نقشہ نویس خلف شیخ محمدی مالک مطبع ٹیمپل پریس تلمیذ میر ناسر فراز حسین طرار دہلوی۔ (۹) میرزا یعقوب بیگ مبارک طالب علم مڈل کلاس خلف میرزا عبد اللہ بیگ ناظر عدالت ریاست پٹیالہ۔ (۱۰) سید محمد محسن متین برادر کہین وزیر الدولہ مدبر الملک خلیفہ سید محمد حسن خاں بہادر وزیر اعظم ریاست پٹیالہ۔

متین نے ایک غیر طرح بہاریہ قصیدہ لکھا ہے جو پٹیالہ نریش راجہ رندھیر سنگھ کی مدح میں ہے اور ذیل کے مطلعے سے شروع ہوتا ہے:

نشاط فصل بہاری اگر کروں تحریر
چمن ہو صفحہ، قلم عندلیب، نغمہ صریر

نیز پنڈت مسی لال فارغ ڈپٹی انسپکٹر مدارس حلقہ ریاست پٹیالہ، سید باقر حسین احسن، منشی محمد قاسم نقشہ نویس (بہ تفصیل نمبر ۸) کی غیر طرحی غزلیں درج ہیں۔

فہرست مندرجہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ شعرائے مشمولہ بالعموم ایک شہر پٹیالے سے متعلق ہیں جو علاقے کے دوسرے اُردو شعراء کی تعداد کا اندازہ کرنے کے لئے کچھ کم نہیں۔ نیز ایک ہی جگہ کے شعراء کی شرکت کی وجہ جہاں تک میں سمجھا ہوں یہ ہے کہ ابھی رسالہ کا پہلا ہی نمبر منصۂ شہود پر آیا ہے۔ دوسرے نمبروں کے شائع ہونے پر جب بتدریج اس کی مقبولیت اور شہرت بڑھی ہوگی تو دوسرے مقامات کے شعراء و اہل قلم بھی اس میں شریک ہوئے ہوں گے۔

مضمون نثر مشمولۂ رسالہ میں مضمون نگار کا نام درج نہیں کیا گیا بلکہ "راقم" لکھ کر اس کے نیچے "ہمیں کچھ کہنے کا [illegible]"

ٹائیٹل پر ایک کارٹون بھی دیا گیا ہے۔ ابتدائی سرورق کی دوسری جانب ماہنامے کا دستور العمل تحریر ہے جو اس وقت کے دوسرے رسائل سے کسی قدر جداگانہ سا معلوم ہوتا ہے لہٰذا ذیل میں حرف بحرف اس کی نقل کر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ عنوان اس کا "دستور العمل آئینۂ سخن عرف سراپائے معشوق" قائم کر کے حسب ذیل قلیں تحریر میں لائی گئی ہیں:-

"۱- یہ گلدستہ ہر انگریزی مہینے کی ۲۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ ۲- اپنی قدر پہلے لیتا ہے۔ مابعد کو بالائے طاق رکھتا ہے۔ جو صاحب مابعد پر نظر رکھیں گے دید سے محروم رہیں گے۔ ۳- قدردانہ عام شائقین سے مع محصول ڈاک ایک روپیہ سالانہ۔ والیان ملک و رؤسائے عالی عظام سے بہ نظر قدردانی جو مرحمت ہو۔ ۴- ہر تحریر جواب طلب کے لئے ۔ر کا ٹکٹ یا جوابی پوسٹ کارڈ آنا چاہئے ورنہ بے رنگ کی شکایت معاف۔ ۵- جن حضرات کی خدمت میں بہ نظر قدردانی بھیجا جاوے اور شرف قبولیت نہ پاوے فوراً بذریعہ کارڈ وغیرہ اطلاع دیں ورنہ نام نامی درج رجسٹر خریداران ہو کر رسالہ برابر بھیجا جائے گا مابعد کو وہ چندہ قیمت کا مطالبہ کیا جاوے گا۔ ۶- قدردانہ ہمیشہ بذریعہ منی آرڈر یا پوسٹل نوٹ آنا چاہئے ورنہ تلف ہو جانے کے ہم ذمہ دار نہ ہوں گے۔ ۷- خریدار اور غیر خریدار کوئی ہوں سب کا کلام درج ہوگا مگر غیر طرح بشرط گنجایش۔ ۸- ہر ایک غزل خوش خط آنی چاہئے۔ در صورت بدخطی کے ہم شعر کٹ جانے کے شکوہ سے بری۔ ۹- ہر ایک صاحب غزل کی پیشانی پر نام نامی مع تخلص پتہ وغیرہ پورا پورا تحریر فرما دیں۔ ۱۰- ہر قسم کی خط کتابت بنام عبدالحلیم نادم منیجر گلدستہ ہونی چاہئے۔ ۱۱- غزل گیارہ شعر تک بشرط عمدگی درج ہوگی۔ زیادہ آدھ آنہ فی شعر کے حساب سے درج ہو سکتی۔ ۱۲- انتخاب اپنے کلام کا شعرا کو اپنے ہی ذمہ سمجھنا چاہئے ورنہ کمیٹی کو مجبوراً انتخاب کرنا پڑے گا۔"

مذکورالصدر بارہ قلموں کے بعد اکتوبر اور نومبر کے طرحی مصرعے بقید ردیف قافیہ درج ہیں جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ آخر "ٹائیٹل کے بیرونی حصے پر "دہلی پنچ لاہور" سے دو لطیفے منقول ہیں اور دوسرے کالم میں "کشمیر پنچ" کا اشتہار ہے، جس کو حکیم محمد وارث علی خاں مالک مطبع (غالباً باسم کشمیر پنچ) بخام آنوالہ ضلع بدایوں سے نکالتے تھے۔ پھر "غدر" کے زیر عنوان اشاعت گلدستہ کی تاخیر پر معذرت کی گئی ہے کہ مدیر علیل تھے اور پھر "اشتہار مطبع شیپل پریس" کی سرخی کے تحت ایک کتاب بنام "خوان نعمتہائے انگلستان" کا اشتہار درج کیا گیا ہے۔ نیز یہ کہ جو صاحب اس پریس میں کچھ چھپوانا چاہیں وہ بذریعہ خط کتابت معاملہ طے کر لیں۔ سنہرے نوٹ پیپر اور لفافے ہر وقت برائے فروخت اس مطبع میں موجود رہتے ہیں۔ یہ اشتہار شیخ محمدی مالک مطبع کی جانب سے چھپا ہے۔

مراسلات

# تلفظ اور املا کے متعلق تصریحات

۲۱ فروری ۱۹۶۳ء کے ہماری زبان میں تلفظ اور املا کے متعلق ڈاکٹر گیان چند صاحب کا مضمون پڑھا۔ مضمون کا انداز بیان ایسا نہیں ہے جیسا کسی پیچیدہ مسئلہ پر سرجوڑ کر اور کندھے ملا کر بحث کرنے والوں کا ہوتا ہے۔ حیرت ہے۔ ڈاکٹر صاحب جیسا اردو دوست اصلاحی تجاویز پر اتنا برہم ہو جاتا ہے۔

میں نے واضح طور پر کہا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے جن الفاظ کے تلفظ کا ذکر کیا ہے ان کا واقعی وہی تلفظ ہوتا ہے جو آپ فرماتے ہیں۔ ہاں صرف کہنا کا कहना بجنس کا ... ، اور بیہود کا बेहूदा ، بہار میں تلفظ نہیں کیا جاتا کیا اس کا یہ مطلب نہیں ہوا کہ بہار کے پڑھے لکھے حضرات باقی تمام کا آپ کی طرح ہی تلفظ کرتے ہیں؟ ایسی حالت میں اس ناچیز پر اختلاف تلفظ کا الزام لگانا کیا بے انصافی نہیں ہے؟

جہاں تک تین خفیف اعرابوں کا تعلق ہے میں واضح طور پر اس کے دو اعرابوں کی اہمیت کا اعتراف کر چکا ہوں۔ اس کے متعلق میں نے صرف اس قدر عرض کیا ہے کہ اگر قدما نے زیر اور پیش کو دو دو آوازوں کے لئے مقرر نہیں کیا ہے تو یقیناً زیر اور پیش میں ہندی کے इ اور उ کی آوازیں ملی ہوئی ہیں اس لئے میں نے تجویز رکھی ہے کہ انھیں ایک ایک آواز کے لئے ہی استعمال کیا جائے اور اگر اس سے تلفظ میں اختلاف ہو تو دوسری پیچیدگیوں اور علمی دشواریوں سے بچنے کے لئے ہمیں قبول کر لینا چاہیے۔

مجوزہ خفیف اعرابوں کا استعمال فارسی اور عربی کو چھوڑ کر باقی کسی بھی زبان کے الفاظ کے ساتھ نہیں ہوتا۔ (یہ دوسری بات ہے کہ ہم بعض ہندی الفاظ (بہار) کو بگاڑ کر (बहार) بول رہے ہیں) فارسی اور عربی کے الفاظ یوں تو کم استعمال ہونے ہی لگے ہیں لیکن جو استعمال ہو رہے ہیں ان میں تقریباً ۸ فی صد (۱۴ + ۱۰۰) میں ہی پیش اور زیر دونوں کا استعمال ہوتا ہوگا۔ اس استعمال میں بھی ۵۰ فی صد استعمال بطور इ ور उ ہی ہوتا ہے۔ لہٰذا اتنے مختصر الفاظ کے تلفظ میں اگر کسی ضابطہ اور عظیم مقصد کے تحت اختلاف ہو تو ہمیں اس کے لئے رضامند کرنا چاہیے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ میں نے اہل زبان اور زبان داں حضرات سے تلفظ کے معاملے میں رواداری برتنے کی اپیل کی ہے۔

میں معیاری اُردو یا اُردوئے معلّٰی سے بحث نہیں کرتا۔ میں ان ممتاز ادبا اور شعرا کی باتیں نہیں کرتا جنھوں نے سالہا سال کی محنت و مشقت سے اعلیٰ ادبی صلاحیت پیدا کر لی ہے۔ میں تو ملک کے ان کروڑوں انسانوں کی باتیں کر رہا ہوں جن کو ہم اُردو پڑھا لکھا کر مختلف کاروبار میں لگا دیں گے۔ لہٰذا میں اُردو میں اتنی صلاحیت پیدا کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ کم سے کم وقت اور محنت میں سیکھی جا سکے۔ جو لکھی جائے وہی پڑھی جائے۔ ہندی سے اس کا قریبی ربط ہو تاکہ ہم اس میں اپنا کاروبار کر سکیں، کاروبار کی رپورٹ تیار کر سکیں، روداد لکھ سکیں، خطبات لکھ کر پڑھ سکیں، اخبار اور رسالوں کا مطالعہ کر کے اپنی ادبی صلاحیت بڑھا سکیں، مقامی اخلاقی کہانیوں اور لوک گیتوں کو اُردو رسم الخط میں لکھ سکیں۔ اور اگر کسی وجہ سے ابتدا میں اُردو پڑھنے کا موقع نہ ملا ہو تو صرف حروف اور اعراب کی شکل پہچان کر اپنے طور پر اُردو سیکھ لیں۔ اس لئے یہ بہت ضروری ہے کہ ہندی اُردو اعرابوں میں زیادہ سے زیادہ ربط ہو۔

فرض کیجیے سلیم نے ابتدا میں ہندی پڑھی۔ اب وہ اُردو سیکھنا چاہتا ہے۔ اس نے اُردو کے حروف اور اعرابوں کو پہچان لیا وہ سوچ سمجھ کر मेला ' केला ' धोबी ' मोदी لکھنا چاہتا ہے۔ خفیف اعرابوں سے وہ الجھن میں پڑ جائے گا۔ مُدی یا مودی، دُھبی یا دھوبی، کِلا یا کیلا، مِلا یا میلا، لکھ دے گا۔ اگر یہ اعراب نہ ہوتے تو وہ یقیناً دھوبی، کیلا اور میلا ہی لکھتا۔ ظاہر ہے کہ تین خفیف اعرابوں سے مشابہ برابر اختلاف تلفظ کے لئے بڑی پیچیدگی بڑھ جائے گی۔ اُردو اعرابوں کا ہندی اور بنگلا وغیرہ زبانوں کے اعرابوں سے ربط پیدا نہیں ہوگا۔

پس اسی عظیم مقصد کے تحت میں نے اُردو دوستوں سے تلفظ کے معاملے میں فراخ دل ہونے کی اپیل کی ہے۔ اختلاف تلفظ ہمیشہ اور ہر زبان کے ساتھ رہا ہے۔ اور آج بھی اگر تلفظ کے معاملے میں رواداری نہ برتی جائے تو شاید دلی میں بھی کان بند کر کے چلنا پڑے گا اور ہر گھر میں آستینیں تک چڑھنے لگیں گی۔ آج ہم محسن کا मोहसिन کتاب کا केताब کسان کا केसान مہر کا मोहर کہرام کا कोहराम سہرا کا सेहरा بولنا صحیح مانتے ہیں تو عوام اور اگر ہندی داں بھی عوام ہیں تو پڑھے لکھے ہندی داں تک بھی मुहसिन सिहरा اور कुहराम ' मुहर ' किसान ' किताब بھی لکھتے پڑھتے ہیں۔ اور جب ہم یہی بولنا فصیح مان لیں گے تو اس طرح بولنے والے بھی مل لیں گے۔

ایسی حالت میں چند مختصر الفاظ کے تلفظ میں اگر فارسی اور عربی سے اختلاف ہوگا تو یہ کوئی ایسا گناہ نہ ہوگا جس کا کفّارہ نہ ہو سکے۔ وہ ہم پر کیا ہنسیں گے جبکہ وہ خود ہمارے ہزاروں الفاظ کو بول تک نہیں سکتے۔ ہم نے تو ان کے تمام الفاظ کو پوری صحت کے ساتھ بولنے کا پورا التزام کر رکھا ہے۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہی کہیں گے کہ فلاں ضابطہ کے تحت اُردو والوں کا یہ انداز بیان ہے۔

اور اگر اس حد تک اُردو دوست فراخ دل نہیں ہونا چاہتے تو زیر اور پیش کے استعمال میں جیسا کہ میں نے اپنے

مضمون کے آخری حصّے میں کہا ہے اور اس کے متعلق کچھ اور بھی کہا جاسکتا ہے لچک پیدا کر لیجئے اور اس قاعدہ کے بعد جتنے الفاظ کے تلفظ میں اختلاف ہو انھیں قبول کر لیجئے یا اگر نیچے سے پڑھ کر آپ کو تلفظ عزیز ہو تو انھیں خفیف کے بدلے طویل اعراب سے لکھیئے اور اگر یہ بھی قبول نہ ہو تو میں دو خفیف اعرابوں کی تائید کرتا ہوں۔ چھوڑئیے یہ بحث۔ ابھی وقت نہیں آیا ہے۔ اُردو ہندی الفاظ کی چھنٹ ہو جانے دیجئے، رواداری خود آئے گی، دعوت دے کر آئے گی یا آنے کی ضرورت ہی نہ پڑے گی۔

پس یہی میری تجویز ہے۔ اگر تجویز پیش کرنا جُرم ہے تو میں اقبالِ جُرم کرتا ہوں۔ اور اگر نہیں تو اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرنے کے لئے اُردو دوستوں کو دعوتِ عام دیتا ہوں۔

موصوف نے اپنے مضمون میں چھ طویل اعرابوں کی بحث بھی چھیڑ دی ہے۔ آپ کی تجاویز کے مطابق चोर' तुर ' बैल ' खेत ' झील اور दौर کو ترتیب وار جھیل، کھیت، بیل، طوُر، چوُر دوُر لکھا جائے گا۔ جھیل اور طوُر لکھنے کا طریقہ انجمن کی پرانی تجویز ہے۔ باقی تمام کو اگر مجوزہ اعرابوں کے عین مطابق لکھا جائے تو کیا انھیں खिपत 'दवर' اور 'चवर' 'बयल' نہیں پڑھا جائے گا؟ اور نہیں تو پھر اگر ایسا ہی لکھنا مقصود ہو تو کس طرح لکھیں گے؟ واضح رہے کہ اعرابی بحث الفاظ کی نہیں بلکہ آواز کی ہے۔ ممکن ہے دوسری زبانوں کے کچھ الفاظ ایسے ہوں جن کا اسی طرح تلفظ کرنا پڑے۔ جیسے चयन (سنسکرت) بمعنی چُننا۔

موصوف نے کہا ہے کہ اس کے لئے آپ جزم کا سہارا لیں گے۔ مگر جزم دے کر بھی دیکھ لیجئے۔ مذکورۂ بالا الفاظ میں 'ی' اور 'و' بطور حروفِ علت آئے ہیں۔ حروفِ علت کا یہ خاصہ ہوتا ہے کہ یہ اپنے پہلے حرف سے مل کر رواں پڑھا جائے۔ 'یٗ'، 'وٗ' پہ نے لکھنا ہماری پچھلی بھول اور عربی و فارسی کی بے جا تقلید ہے۔ غور فرمائیے اس اصول کے مطابق جزم دینے کی بھی گنجائش نہیں رہی۔ ظاہر ہے کہ آپ کی تجاویز سے ایک لفظ کے تلفظ میں بھی قطعیت پیدا نہیں ہوتی۔

جہاں تک راقم الحروف کی تجاویز کا تعلق ہے میں نے نقطوں کے بدلے نقاشیاں نہیں کی ہیں بلکہ دو نقطوں کو اسی طرح نمایاں کیا ہے جس طرح ہم عام تحریریں (ـ ٨ ٧ ١) دو نقطوں کے بدلے لکھا کرتے ہیں، یہ دوسری بات ہے کہ طباعت میں یہ خوب صورت نہ چھپ سکیں۔ میں ان علامتوں کو (ـ ١ ٨ ٧ ١) ایسا مانتا ہوں۔ گویا ان کے دونوں سروں پر نقطے لگے ہیں۔ مگر نقطے نہ لکھیئے۔ یعنی खेत کو میل، झील کو جھبل، मयल کو کھیت، बैल کو بیل، तुर کو طور، चोर کو چور ('و' کا سر بند) اور दौर کو دور ('و' کا سر بیچ میں کھلا) لکھیئے۔ مطلب یہ کہ محض پڑی، کھڑی اور زاویہ دار لکیروں سے لکھیئے۔ جس طرح ممکن ہو خوب صورت اور قابلِ عمل طریقوں سے لکھیئے۔ موٹے حروف کے ساتھ موٹی اور پتلے حروف کے ساتھ پتلی علامتوں سے لکھیئے، مگر ان علامتوں کی ترتیب نہ بگاڑیئے۔ ان علامتوں کی بھی فرضی کہانی ہے۔ بچے ان کہانیوں کو چاؤ سے سنتے ہیں۔ کہانی سُن کر انھیں علامتیں سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

غور فرمائیے۔ ذرا سی نقطوں کی ترتیب سے ہمیشہ کے لئے ایک بہت بڑا درد سر ختم ہو جاتا ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ اگر اس اصول کو مان لیا جائے تو آج ہی سے اس پر عمل کیا جاسکتا ہے۔ دو منٹ ہر آواز کے دو نقطوں کی مخصوص نمائندہ کو دماغ میں بٹھا لیجئے۔ اخبار اور رسالوں کے ذریعے اس اصول کی کافی تبلیغ کر دیجئے اور پھر تیسرے منٹ سے خطوط اور مضامین لکھیئے، اخبار رسالے اور کتابیں چھاپئے۔ اس کے لئے نہ تو آپ کو زبر دینے کی ضرورت پڑے گی؛ اور نہ زیر کی۔ نہ پیش دینے کی ضرورت ہو گی اور نہ کسی علامت کی۔ ہندی اور غیر ہندی سب کے لئے ایک ہی طرح سے لکھیئے۔ اس سے اُردو کا موجودہ چہرہ مہرہ بھی برقرار رہے گا۔ اس سے ہماری موجودہ کتابیں بھی بے کار نہیں

ہم نے شمشیر اٹھائی ہے صداقت کے لئے
امن و تہذیب و شرافت کی حفاظت کے لئے
سربکف آج ہیں ہم ہند کی عزت کے لئے
(روشن صدیقی)

ہوں گی۔ جب ہم نقطوں کی مروجہ ترتیب (..) دیکھیں گے آج کی طرح سوچ سمجھ کر عبارت کے مطابق صحیح صحیح پڑھ لیں گے۔ اگر بچوں کے ہاتھ میں موجودہ کتاب آئے گی تو ان سے پوچھیں گے بچو! حروف کے نیچے دو نقطوں کی یہ اجنبی ترتیب (..) کہاں سے آگئی؟ معلوم ہوتا ہے 'ی' کنبہ کے کسی باپ بیٹوں کی پہچان کا درمیانی حصہ اُڑ گیا ہے۔ تب تو ان کی پہچان بہت مشکل ہے۔ اب میل کو چار طرح پڑھنا پڑے گا۔ بچو اب سوچ کر پڑھو۔

یہ آم کا پھل ہے۔ (یہ = یہ)
ہمارے گاؤں میں چاول کی ایک میل ہے۔ (میل = مِل)
ہمارے گاؤں کے لوگوں میں میل نہیں ہے۔ (میل = مَیل)
اس کے کپڑے پر بہت میل ہے۔ (میل = مَیل)

(ایم۔ اے۔ حسن۔ بجھنوری)

## رام پرشاد بسمل

مکرمی تسلیم۔ ۱۵ر جنوری ۱۹۶۳ء کے "ہماری زبان" میں صفحہ ۱۱ کالم ۲ پر علامہ اقبال کے مشہور شعر ؎

آخر شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

کو پنڈت رام پرشاد بسمل شاہجہاں پوری کی غزل کا مقطع ظاہر فرمایا گیا ہے اور "آخر شب" کی بجائے "آخری شب" لکھا ہے۔ حالاں کہ "بانگ درا" میں "شمع و شاعر" کے عنوان سے جو نظم ہے اُس میں "شمع" کے جواب کے ذیل دیگر اشعار کے ساتھ یہ شعر اس طرح موجود ہے۔ ؎ آخر شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ، صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا۔

(نسیم السجیدری)

محمد عتیق صدیقی

# تبصرہ

## رسالہ جامعہ — "ابوالکلام آزاد نمبر"

غیر منقسم ہندستان کے اردو رسائل میں رسالہ جامعہ کا ایک مخصوص مقام تھا۔ ہماری آزادی کے جلو میں جو آندھیاں آئیں، انھوں نے اور بہت سی اچھی چیزوں کے ساتھ رسالہ جامعہ کی زندگی کا چراغ بھی گل کر دیا۔ کارکنان جامعہ نے نومبر ۱۹۶۰ء سے رسالہ جامعہ کا دوبارہ اجرا کیا ہے، جو گزشتہ ڈھائی سال سے پابندی سے نکل رہا ہے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ تقسیم وطن نے ہماری ثقافتی زندگی کے جو سوتے بند کئے تھے وہ اب پھر رسنے لگے ہیں، اور ابلنے پر آمادہ ہیں۔

اس مدت میں رسالہ جامعہ کے دو مخصوص نمبر بھی شائع ہوئے ایک تو گزشتہ سال نکلا تھا جس میں ۱۹۶۱ء کے اردو ادب کا جائزہ لیا گیا تھا۔ اس میں خوبیاں بھی تھیں اور خامیاں بھی۔ اب ایک سال بعد اس کو تنقید کا موضوع بنانا غیر ضروری ہے۔ امسال "مولانا ابوالکلام آزاد کی پانچویں برسی کے موقع پر" رسالہ جامعہ کا "مولانا ابوالکلام آزاد نمبر" شائع کیا گیا ہے۔ "کچھ مرحوم کی خدمات کے اعتراف میں، اور کچھ اس لئے کہ ہم مولانا کی یاد کو تازہ رکھنے کے لئے اپنی ذمہ داریوں پر غور کریں۔" اس شمارے کے لکھنے والوں میں آل احمد سرور، غلام رسول مہر، عبد اللہ ولی بخش قادری، ابوسلمان الہندی، ریاض الرحمٰن خاں شروانی اور عبد اللطیف اعظمی کے نام ہم کو نظر آتے ہیں۔

موخر الذکر نے معاصرین کے خطوط سے مولانا آزاد کی تصویر بنائی ہے، ریاض الرحمٰن خاں شروانی نے ابوسلمان الہندی کی کتاب "امام الہند" کا سیر حاصل جائزہ لیا ہے اور ان کی بعض فروگزاشتوں کی نشاندہی کی ہے۔ ابوسلمان الہندی نے مولانا کے بعض قدیم خطوط پیش کئے ہیں جو بعض اعتبار سے اہم ہیں۔ عبد اللہ ولی بخش قادری نے مولانا آزاد کی تقریروں سے ان کے تعلیمی نظریات مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ جہاں تک اس موضوع کا تعلق ہے یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ "بھرتی" کا ہے مولانا آزاد ماہر تعلیم نہیں تھے، اور نہ اس لحاظ سے یہ شعبہ ان کو سونپا گیا تھا۔ اس محکمے کے لئے ان کا انتخاب کیوں کیا گیا تھا؟ اس کا سیدھا جواب یہ ہے کہ کوئی وزیر بھی ہو، وہ اپنے محکمے کا "ماہر" نہیں ہوتا۔ اس کا انتخاب تو اس اعتبار سے کیا جاتا ہے کہ وہ ایک مخصوص محکمے کے کاموں کی نگرانی کی اہلیت رکھتا ہے۔ اور مولانا آزاد میں اس کی اہلیت بدرجہ اتم موجود تھی۔ غلام رسول مہر ان معدودے چند لوگوں میں ہیں جنھوں نے مولانا کو بہت قریب سے دیکھا ہے، اور پاکستان میں "آزاد پرستوں" کے کارواں سالار ہیں۔ انھوں نے مولانا آزاد کی چند جھلکیاں پیش کی ہیں۔

رسالہ جامعہ کا اہم ترین مضمون "ہندستانی قومیت اور مسلمان" ہے، جو آل احمد سرور کے قلم سے نکلا ہے۔ انھوں نے مولانا آزاد کے افکار کی روشنی میں مسلمانوں کے ذہنی امراض کی تشخیص کرنے کی کوشش کی ہے۔ گزشتہ پندرہ برسوں میں مسلمانوں کے مسائل پر، مختلف زاویہ نگاہ سے بہت کچھ لکھا گیا ہے، اور لکھا جاتا رہتا ہے۔ لیکن کوئی بھی کھل کر بات نہیں کرتا اور ہر شخص کی تحریر میں تحفظات ذہنی ضرور ہوتے ہیں۔ جس طرح ایک آزمودہ کار طبیب مریض کے سامنے، اس کے مہلک امراض کی جزئیات کھل کر بیان کرنے سے مصلحتاً گریز کرتا ہے، بالکل اسی طرح مسلمانوں کے مسائل پر لکھنے والے، بیشتر، حقیقت بیانی پر "مصالح" کو ترجیح دیتے ہیں، جو کبھی ذاتی ہوتے ہیں اور کبھی اجتماعی۔ حالاں کہ مسلمانوں کے ذہنی امراض اب اس منزل پر پہنچ چکے ہیں، جہاں مریض کی حالت کا اس کے سامنے کھل کر بیان کرنا ضروری اور ناگزیر ہو جاتا ہے۔ زیر بحث مضمون میں اس "ہیر پھیر" سے بچنے اور دو ٹوک بات کہنے کی بڑی حد تک کوشش کی گئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ عام پڑھے لکھے مسلمانوں کو عموماً اور اہل فکر مسلمانوں کو خصوصاً اس مضمون کو پڑھنا اور اس کو موضوع بحث بنانا چاہیے۔ ذیل میں اس مضمون کا وہ حصہ نقل کیا جا رہا ہے، جہاں آل احمد سرور نے مسلمانوں کے ذہنی امراض کی تشخیص قلم بند کرنے کے ساتھ ساتھ ان کا علاج بھی تجویز کئے ہیں:

۱۔ اسلام اور قومیت میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ ہندستانی مسلمان اسلام کے سچے پیرو ہوتے ہوئے ہندستانی قومیت کے علم بردار رہ سکتے ہیں۔ اس راہ میں جو رکاوٹیں ہیں وہ حسن تدبیر سے دور کی جاسکتی ہیں۔ رکاوٹوں کی ذمہ داری میں سب شریک ہیں۔

۲۔ قومیت کا تصور جیسے جیسے فروغ پاتا جائے گا اور جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتا جائے گا، اسی نسبت سے اکثریت میں مذہب کی بنیاد پر سیاست کو متعین کرنے کا جذبہ کمزور ہوگا اور اگر اقلیت مذہبی بنیاد پر سیاست نہیں چلائے گی تو یہ عمل اور جلد ہوگا۔

۳۔ ہر گروہ کو علاوہ ایک روحانی مرکز کے ایک دنیوی مرکز کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ہندستانی مسلمانوں کے لئے ایسا مرکز قومیت فراہم کرسکتی ہے۔ اس کا مذہب اس دنیوی مرکز کے راستے میں حائل نہیں ہوتا۔

۴۔ ہندوستانی مسلمانوں کے دنیوی، سیاسی اور کاروباری مفادات دوسرے مذہب کے ایسے ہی لوگوں کے ساتھ ہیں۔ ایک مسلمان کلرک کا مفاد ایک ہندو کلرک کے ساتھ، ایک مسلمان استاد کا ہندو استاد کے ساتھ، ایک مسلمان سرمایہ دار کا ہندو سرمایہ دار کے ساتھ ہے۔ نظام حیدرآباد، نواب رامپور یا بمبئی کے مسلمان سیٹھوں کے ساتھ نہیں۔

۔۔جس طرح ہندو مہا سبھا، رام راجیہ پریشد اور جن سنگھ کی مذہبی بنیاد پر سیاست غلط ہے، اسی طرح مسلم لیگ یا جماعت اسلامی کی سیاست بھی غلط ہے۔ بلکہ اقلیت میں مذہب کی بنیاد پر سیاسی جدوجہد اکثریت میں غلط جذبات کو اشتعال دے سکتی ہے۔

۔ ہندوستان میں اسلام کی خدمت کے لئے غیر مذہبی ریاست نے راستہ کھول دیا ہے۔ اسے ایسی حقیقت بنانا چاہیے کہ ہر منزل پر اس پر عمل ہو۔ مسلمان ایسا کر سکتے ہیں اور اس طرح اسلام کے لئے دوسروں میں میلان پیدا کر سکتے ہیں۔

۔ اقلیت کو اپنا جمہوری حق ضرور مانگنا چاہیے مگر قومی زندگی میں بھرپور شرکت کے لئے یہ ضروری نہیں کہ پہلے حق ملے تب مدد ہو۔ فرائض کے ادا کرنے میں سودے بازی نہیں چلتی۔

۔ مولانا آزاد نے سب سے بڑی خدمت یہ کی کہ اپنی تفسیر قرآن کے ذریعہ اسلام کی حقیقی تعلیم پر روشنی ڈالی اور اپنی زندگی کے ذریعہ سے یہ ثابت کیا کہ قومی زندگی میں دل و جان سے شرکت ہی اقلیتوں کے لئے صحیح راہ عمل ہے۔ ان کی یاد کافی نہیں، ان کے نقش قدم پر چلنا ضروری ہے۔

۔ وفاداری ریاست (اسٹیٹ) سے ہوتی ہے حکومت سے نہیں، قوم سے ہوتی ہے کسی سیاسی پارٹی سے نہیں۔

۔ ہندوستانی مسلمانوں کا تعلق خواہ کسی سیاسی پارٹی سے ہو انھیں ہر حال میں ریاست سے اپنا رشتہ مضبوط رکھنا چاہیے رشتے کا تعلق ذہن اور دل سے ہے، اسے کسی دکھاوے کی ضرورت نہیں۔ اگر یہ رشتہ موجود ہے تو اچھی بات ہے۔ اور اگر نہیں ہے تو اسے پیدا کرنا چاہیے، مصلحت یا خوف سے نہیں اصولی طور پر۔ اقبال نے درست کہا ہے ؎

"پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ"

۔ اس وقت ہندوستانی مسلمانوں کو قومی زندگی سے ہم آہنگ کرنے کے لئے بہت بڑی تحریک کی ضرورت ہے۔ اگر ایسے کام میں دیر کی گئی تو نقصان ہو جائے گا۔ اس سلسلے میں سرسید کی مثال مفید ہو سکتی ہے جس طرح سرسید نے تہذیب الاخلاق کے ذریعہ سے ایک ذہنی انقلاب برپا کیا اور ہندوستان کے مسلمانوں کو جذباتیت اور شرقیت کے محدود تصور سے نکال کر عقلیت اور آفاقیت کی طرف لائے، اسی طرح آج ایک اور تہذیب الاخلاق کی ضرورت ہے جو ہندوستانی مسلمانوں کو ایک طرف قومیت سے ہم آہنگ کرے، دوسری طرف عالمی افکار کو جذب کر کے ان کو اس قابل بنائے کہ وہ موجودہ دور میں اپنے لئے ایک باعزت جگہ بنانے میں کامیاب ہو سکیں۔

۔ اس کام کے لئے ایسے مسلمان ہی آگے آ سکتے ہیں جن کا حکومت سے تعلق نہ ہو۔ ان کے لئے قدیم و جدید دونوں علوم سے واقف ہونا ضروری ہے۔ آج وہی لوگ ہندوستانی مسلمانوں کی قیادت کر سکتے ہیں جو ایک طرف اسلام کی تعلیم سے اور اس کی تاریخ سے اچھی طرح واقف ہوں، دوسرے جو ہندوستان کی تاریخ کا اور اس کے ادبی سرمائے کی اہمیت کا احساس رکھتے ہوں اور تیسرے جن کا ذہن جدید علوم کی روح تک پہنچے اور ان سے اپنے طور پر کسب فیض کرنے کے قابل ہو۔

"۱۳۔ ہمارے یہاں ہر تحریک سے بہت جلد نتائج کی توقع ہوتی ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کو ہر جماعت سبز باغ دکھاتی ہے اور اس کے سامنے نتائج کی تصویر اس طرح آتی ہے جس طرح مشین میں اکنی ڈالی اور ٹکٹ نکل آیا۔ قومی زندگی میں صحیح رجحانات کی تعمیر بڑا خلوص، پیہم ریاض اور ناقابل شکست حوصلہ چاہتی ہے۔ اس لئے اس لائحہ عمل کو فوری سیاست کے خطوط پر نہیں ذہنی اور تہذیبی سطح پر چلانا چاہیئے۔ ایسے کے نتائج خواہ دیر میں نکلیں مگر وہ دیرپا ہوں گے۔ بقول ثاقب لکھنوی ؎

"مکاں ستم کا سونے سے یہ خون دل سے بنتا ہے
خس و خاشاک کا گھر بھی بڑی مشکل سے بنتا ہے"

سرور صاحب نے صرف "حال" اور "ماضی قریب" کی روشنی میں حالات کا جائزہ لیا ہے، لیکن صورت حال کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے ضروری ہے کہ سرسید کے عہد سے لے کر محمد علی جناح کے وقت تک کی مسلمانوں کی تاریخ کا تفصیل اور بے لاگی سے جائزہ لیا جائے اور ان "بتوں" کو، جو "جماعت کی آستینوں" میں نہیں بلکہ ان کے ذہنوں کی انتہائی گہرائیوں میں چھپے ہیں، بے نقاب کیا جائے، تاکہ ان کو معلوم ہو سکے کہ اب تک

یاراں دیگرے را می پرستند

پچھلی ایک صدی کی ہندوستانی سیاسی تاریخ نے عموماً اور گزشتہ تین صدیوں کی اسلامی ہند کی تاریخ نے خصوصاً جو دیو پیکر شخصیتیں پیدا کی ہیں، ان میں مولانا آزاد ایک بلند مقام کے مالک ہیں۔ آج ہم ان کے ساتھ جتنی بھی بے اعتنائی برتیں، لیکن مستقبل کا مورخ ان کی شخصیت اور ان کی خدمات کو نظر انداز نہ کر سکے گا۔

کارکنان رسالہ جامعہ یقیناً قابل مبارک باد ہیں کہ انھوں نے مولانا کی "یاد کو تازہ رکھنے کے لئے" ایک معقول نمبر نکالا۔ پورے رسالے کو شروع سے آخر تک پڑھنے کے بعد ایک کمی بھی محسوس ہوتی ہے، جس کی طرف اشارہ کر دینا بے محل نہ ہوگا اور وہ یہ ہے کہ اس بات کا بھی ایمان داری اور غیر جانب داری سے جائزہ لینے کی اشد ضرورت ہے کہ ———— مولانا آزاد کی وفات کے بعد سے لے کر اس وقت تک۔ پانچ برسوں میں، ہم نے مولانا آزاد پر کتنا کام کیا؟ ساہتیہ اکیڈیمی، جس نے مولانا آزاد کی تمام تصانیف، ان کے مکاتیب اور ان کی تقریروں کے نفیس ایڈیشن شائع کرنے کا بیڑہ اٹھایا تھا، اس نے اب تک کتنی جلدیں شائع کیں؟ ان کے کتنے مکاتیب حاصل کئے؟ ان کے ابتدائی دور کے کتنے مضامین جمع کئے؟ اس احتساب کی زد میں چونکہ ہماری بعض محترم اور بزرگ شخصیتیں بھی آجاتی ہیں، اس لئے مصلحتاً خاموشی اختیار کرنا کوئی مستحسن بات نہیں ہے۔ اس موضوع پر بھی کھل کر لکھنے کی اشد ضرورت ہے۔